© rasailojaraid.com

قسط نمبر ۴

دو مذہبی نظام ہائے فکر

تخلیقی اور تقلیدی

☆ الطاف جاوید

سائنس اگر وجود اور اُس کے مظاہر کے مرحلہ بمرحلہ تفصیلی و تجزیاتی علم کا ذریعہ ہے تو شعورِ نبوت ان کے مبداء و معاد اور اُن کی تخلیقی غایت کا علم ہے۔ مذہبی تقلیدی نظام نے ان دونوں علوم میں سے سائنسی علم کو انسانی علم اور شعورِ نبوت کے حاصلات کو علم الٰہی قرار دے کر انسانی ارتقاء کے عمل میں ایک ناقابلِ حل رکاوٹ پیدا کر دی ہے۔

اس نظام نے ان دونوں مصادرِ علوم میں باہمی ربط و تعلق کو نظر انداز کر دیا اور اِن کو الگ الگ خانوں میں تقسیم کر دیا، جس سے ان کے درمیان ایک ناقابلِ عبور خلیج حائل ہو گئی۔ اب انسانی ذہن اپنے دورانِ عمل میں ایک ہولناک اُلجھن میں مبتلا ہو گیا کہ اگر وہ سائنسی علم پر اپنی توجہ مرکوز کرے تو حیاتِ اُخروی میں اُس کی نجات خطرہ میں پڑتی ہے۔ کیوں کہ اُسے بتایا گیا ہے کہ سائنسی علم تو انسان کی اپنی ذہنی کاوش کا تخلیق کردہ علم ہے۔ اس لئے اس کا کوئی دینی مقام نہیں ہے، اور اپنی حیثیت میں غیر دینی ہونے کی وجہ سے اس کا شمار انسان کی اُن سرگرمیوں میں نہیں ہو سکتا جن سے نیک اعمال کا چشمہ پھوٹتا، اور نجاتِ اُخروی حاصل ہوتی ہے۔ اور اگر انسانی ذہن سائنسی علم و عمل کو نظر انداز کر کے عبادات و اذکار پر اپنے وقت کا غالب حصہ صرف کرے تو فطرت، سماج اور نفس میں کام کرنے والی قوتوں اور قوانین کی تسخیر سے محروم رہ کر خلافتِ الٰہی کے بلند مرتبہ کی عظمتوں سے بے نصیب رہتا ہے۔

اس میں کوئی شک نہیں کہ سائنسی علم و عمل اگر انسان کو خلافتِ الٰہی سے سرفراز کرتا ہے تو عبادات و اذکار اُس کے نفسیاتی تزکیہ و انجلاء سے اُسے نیابتِ الٰہی کی نعمتِ عظمیٰ سے ہمکنار کرتے ہیں۔

خلافتِ الٰہی اور نیابتِ الٰہی کے دونوں مقامات کا حصول حیاتِ انسانی کو مکمل کرتے اور نجاتِ اُخروی کی ضمانت بنتے ہیں۔ کیوں کہ یہ دونوں مقامات ایک دوسرے کی تکمیل کرتے ہیں۔ ایک سے محرومی دوسرے کی عدمِ تکمیل کا باعث بنتی ہے۔ اس طرح ان دونوں میں ایک نامیاتی ربط اور ایک تفاعلی تعلق پایا جاتا ہے۔ اس ربط و تفاعل سے زندگی کے تمام اعمال مسلسل عبادت کی حیثیت اختیار کر لیتے ہیں۔ انسان تسخیرِ فطرت، خیرِ کلی اور حُسنِ کامل کی اقدار کو بتدریج حاصل کرتا چلا جاتا

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

ہے اور اس طرح انفرادی و اجتماعی لحاظ سے اپنی نوعی غایت کے تحقق کے قابل ہو جاتا ہے۔

مگر مذہبی تقلیدی نظام نے سائنسی علم کو علم الٰہی کے دائرہ سے خارج کر کے خلافت و نیابتِ الٰہی کی وحدت کو ضائع کر دیا اور انسانی فکر و عمل کو ناقابلِ حل ثنویت میں مبتلا کر دیا، جس سے اُس کے ارتقائی عمل کی رفتار میں سست روی اور شدید اُلجھنیں پیدا کر دی ہیں۔

سائنس کے تدریجی، تجزیاتی اور تجرباتی پراسس سے حاصل کردہ علم کو، جو اپنی نوعیت میں غیر جانب دار، بے لوث اور عالم گیر ہے اور جس کے حصول میں جتنا وقت صرف ہوتا ہے، وہ مسلسل عبادت میں شمار ہوتا ہے، علمِ الٰہی کے دائرہ سے نکال دینے کا ایک نتیجہ یہ نکلتا ہے کہ ملّتِ اسلامیہ میں خاص طور پر اور دیگر مذاہب میں عام طور پر علم بالوحی کی تشریح و تفسیر کرنے کی اجارہ داری کا حامل ایک مخصوص گروہ ہو جاتا ہے۔ جو کتبِ مقدسہ کے مفہوم کو حیاتِ تازہ اور حیاتِ امروز کے مسائل سے الگ کر کے اُنہیں غیر معاشرتی توہمات اور التباسات میں بدل دیتا ہے۔ اس گروہ کی بیان کردہ تشریح و تفسیر کا حیاتِ معاشرہ کے ساتھ کوئی تعلق نہیں ہوتا۔ اس کی حیثیت FAIRY TALES جیسی ہوتی ہے، جس کی مدد سے انسانی ذہن زندگی کے کسی اُلجھاؤ کو سلجھانے کی بجائے اُلٹا اس تشریح و تفسیر کے ساحرانہ توہمات کی افیون سے اپنے ہوش و حواس کھو بیٹھتا ہے۔

یہ مخصوص مذہبی گروہ اپنی تفسیر و تشریح سے محنت کش طبقوں کو ذہنی لحاظ سے اپاہج کرنے کا کام لیتا ہے تاکہ وہ استحصال پسند طبقوں کے خلاف اپنی آواز اُٹھانے کے قابل نہ رہیں۔ یہ طبقہ اُنہیں بتاتا ہے۔ کہ اس کتابِ مقدس کا مقصود امیر اور غریب کے معاشی، سیاسی اور تہذیبی فرق کو مٹانا نہیں بلکہ سب کو 'خدا کا نیک بندہ' بنانا ہے۔ خدا ہی نے امیر و غریب کی تقدیر کو لکھا ہے۔ لہٰذا صبر و شکر کے سوا اور کوئی چارہ نہیں ہے۔

انسانی تاریخ کی کہانی میں اس تشریح و تفسیر نے جن بھیانک نتائج کو پیدا کیا ہے، وہ آقاؤں کا غلاموں پر قہرناک ظلم و جور، عورت کی غلامی و بے چارگی، قوموں کی قوموں پر چڑھائی، محنت کش عوام کی محنت کے استحصال، سرمایہ کے چند ہاتھوں میں جمع ہونے اور حقیقت و مافیہ پر رسم و ہیئت پرستی کو ترجیح دینے کی شکل میں ہمارے سامنے ہیں۔

اس گروہ نے ایسی ذہنی فضاء پیدا کر دی ہے کہ ملّتِ اسلامیہ میں سوشل ریفارمر، معاشی

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

مصلحین اور سائنس و ٹیکنالوجی کے ماہرین کی بجائے نام نہاد مجدد، مفسّر، مجتہد، الامام اور الہادی پیدا ہوتے ہیں۔ جو اس مظلوم ملّت کو توہماتی اور غیر معاشرتی تصورات کے اندھیروں میں اور دھکیل دیتے ہیں۔ ان حضرات کی بدولت ملّتِ اسلامیہ اپنے معاشی، سیاسی اور تہذیبی مسائل کو حل کرنے اور اُنہیں مزید ترقی دینے کی بجائے مذہب کے مابعد الطبیعیاتی موضوعات پر بحث و مباحثہ میں مبتلا ہوگئی۔ مذہب کا یہی وہ پہلو ہے، جسے عہدِ حاضر کے ایک مفکّر نے افیون قرار دیا ہے۔ اور ہمارا مذہبی دانش ور اس افیون کی تیاری میں شب و روز مصروف رہتا ہے۔

علّامہ اقبالؒ نے "ارمغانِ حجاز" میں ابلیس کی زبان سے اسلام کے انقلابی و تخلیقی امکانات کا ذکر کرنے کے بعد اسی صورتِ حال کی طرف اشارہ فرمایا ہے۔ ابلیس کہتا ہے کہ اگر مجھ کو کوئی خطرہ ہے تو اس اُمت سے ہے جس کی خاکستر میں اب تک شرارِ آرزو ہے۔ پھر وہ اسلام کی تعریف میں کہتا ہے کہ آئینِ پیغمبرؐ ناموسِ زن کا محافظ، مرد آزما اور مرد آفریں ہے۔ یہ ہر نوع غلامی کے لئے پیغامِ موت ہے۔ اس میں نہ کوئی فغفور و خاقان ہے نہ فقیرِ راہ نشیں۔ یہ دولت کو ہر آلودگی سے پاک و صاف کرتا ہے اور منعموں یعنی مالداروں کو مال و دولت کا امین بناتا ہے۔ اس سے بڑھ کر فکر و عمل کا کیا انقلاب ہوگا کہ یہ زمین اللہ کی ہے بادشاہوں کی نہیں۔

اپنے مشیروں کو اسلام کے ان متوقع خطرات سے متنبہ کرنے کے بعد ابلیس اُن سے یوں مخاطب ہوتا ہے:۔

چشمِ عالم سے رہے پوشیدہ یہ آئیں تو خوب — یہ غنیمت ہے کہ خود مومن ہے محرومِ یقیں
ہے یہی بہتر الٰہیات میں اُلجھا رہے — یہ کتاب اللہ کی تاویلات میں اُلجھا رہے
توڑ ڈالیں جس کی تکبیریں طلسمِ شش جہات — ہو نہ روشن اس خدا اندیش کی تاریک رات
ابنِ مریم مر گیا یا زندۂ جاوید ہے — ہیں صفاتِ ذاتِ حق سے جدا یا عینِ ذات
آنے والے سے مسیحِ ناصری مقصود ہے — یا مجدّد جس میں ہوں فرزندِ مریم کے صفات
ہیں کلام اللہ کے الفاظ حادث یا قدیم — اُمتِ مرحوم کی ہے کس عقیدے میں نجات
کیا مسلماں کے لئے کافی نہیں اس دور میں — یہ الٰہیات کے ترشے ہوئے لات و منات
تم اسے بیگانہ رکھو عالمِ کردار سے — تا بساطِ زندگی میں اس کے سب مہرے ہوں مات

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

خیر اس میں ہے قیامت تک رہے مومن غلام — چھوڑ کر اوروں کی خاطر یہ جہانِ بے ثبات
ہے وہی شعر و تصوف اس کے حق میں خوب تر — جو چھپا دے اس کی آنکھوں سے تماشائے حیات
ہر نفس ڈرتا ہوں اس اُمت کی بیداری سے میں — ہے حقیقت جس کے دیں کی احتسابِ کائنات
مست رکھو ذکر و فکرِ صبحگاہی میں اُسے — پختہ تر کر دو مزاجِ خانقاہی میں اُسے

اب اِس افیون کا ایک ہی توڑ ہے کہ سائنس اور ٹیکنالوجی سے حاصل شدہ علم کو انسانی علم قرار دے کر نجس و ناپاک تصور نہ کیا جائے۔ بلکہ اس کے برعکس پنہائے ارض و سماء میں پھیلے ہوئے وجود اور اُس کے مظاہر کے علم کو جنہیں انسان نے نہیں خود حق تعالیٰ نے تخلیق کیا ہے، علم الٰہی تسلیم کیا جائے۔ کیونکہ مظاہر کے روپ میں حق تعالےٰ کی خود اپنی ذاتِ اقدس جلوہ گر ہے اور یہ بات تو عیاں ہے کہ وجود اللہ کا ہی ہو سکتا ہے۔ غیر کا نہیں، ورنہ شرک لازم آئے گا۔

قصہ مختصر۔ حیاتِ انسانی کو جو مسائل آج درپیش ہیں اور جن کا صحیح حل نہ ملنے کی وجہ سے انسانی صفوں میں انتشار و افتراق پھیلا ہوا ہے، ایٹمی جنگ کی تباہ کاریوں کے خوف سے خون خشک ہوا جا رہا ہے، نوخیز نسلِ انسانی حیات کی غایتِ اُولیٰ پر مطلع نہ ہونے کی وجہ سے اخلاقی اور روحانی افلاس میں مبتلا ہے اور مذہبی پیشوائیت غیر سماجی اور توہماتی تصورات کی افیون تیار کرنے اور اُسے تقسیم کرنے میں مصروف ہے۔

اِن تمام غلط اور غیر انسانی رجحانات و میلانات کا علاج نظری لحاظ سے ثنویت کی بجائے توحید کو اپنا لینے میں ہے۔ تاکہ حیاتِ انسانی، جس کا منبع و مصدر خود ذاتِ باری تعالیٰ ہے، اپنے تمام پہلوؤں اور رُخوں میں ایک نامیاتی کُل متصور ہو سکے اور اُس کے حُسن کو نکھارنے، اُس کے عمرانی فکری اور روحانی و اخلاقی اداروں کو ارتقا پذیر اور ترقی کرنے کے لئے جو بھی قدم اُٹھایا جائے وہ بیک وقت دنیوی بھی ہو اور دینی بھی، اور اس عمل میں جتنا وقت صرف ہو، اُسے مسلسل عبادت شمار کیا جائے۔ فطرت، سماج اور نفسِ انسانی سے متعلق سارے سائنٹی فک علم کو علم الٰہی کا حصہ تصور کیا جائے، جسے علم بالوحی کی روشنی میں انسان اپنی نوعی غایت کے حصول کے لئے استعمال میں لا سکے، تاکہ وہ اس کرۂ ارض پر خلافت و نیابتِ الٰہی کے مقامِ عظمٰے پر فائز ہو کر اپنی تکمیل کا مظاہرہ کر سکے۔

اگر یہ کہا جائے کہ کون سی مذہبی شخصیت کو اس تقلیدی مذہبی نظام کے دائرہ سے باہر سمجھا

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

جائے، تو اس کا جواب یہ ہے کہ جو فطرت اور معاشرہ کے ارتقائی اور تخلیقی عمل کو تسلیم کرے اور اس عمل کی منطق کے مطابق ہر نئے عہد کے نئے تقاضوں اور مطالبات کو پورا کرنے کی جدوجہد کرے اور مذکورہ بالا رجعت پسند اور دشمنِ ارتقاء و تخلیق اقدار کا انکار کر دے۔ قرآنی فکر کے عالم گیر اور ہمہ گیر مضمرات و متضمنات کو معروضی طور پر جیتی جاگتی شکل میں لانے کے لئے راستہ کی فکری و عملی رکاوٹوں اور رجعت پسند قوتوں پر قابو پانے کی مجاہدانہ کوشش کرے تو وہ شخصیت خود بخود اس مقلدانہ نظام سے باہر متصور ہوگی، کیوں کہ اُس نے اپنے صحت مند اور تخلیقی شعور کا ثبوت دیا ہے۔

اسلام زندگی کو ایک نامیاتی کُل تصور کرتا ہے۔ اس کُل کے مختلف پہلوؤں کو تو دیکھا اور جانچا جا سکتا ہے مگر اِن کو ایک دوسرے سے الگ الگ نہیں کیا جا سکتا۔ کیونکہ ان کے درمیان نہ صرف ہم رشتگی[1] اور تفاعل[2] ہی پایا جاتا ہے، بلکہ یہ باہم ایک دوسرے پر منحصر بھی ہیں۔ یہ تو ممکن ہے کہ ان تمام پہلوؤں میں سے کسی ایک پہلو کو وقت کی ضرورت کے مطابق باقی پہلوؤں سے اہم قرار دے دیں اور اپنی توجہ کی زیادہ مقدار اس پر خرچ کریں۔ مگر یہ بات شاید ناممکن ہے کہ اس ایک پہلو کو باقی پہلوؤں سے قطعاً علیحدہ کر کے اُس سے کام لے سکیں۔

اس کا معنیٰ یہ ہے کہ اسلام اپنے نظریاتی اور فکری ڈھانچہ میں کسی قسم کی ثنویت اور شرک آمیز خیالات کو برداشت نہیں کرتا۔ یہ دونوں نظریات اسلام کی روح کے قطعاً مخالف ہیں۔

اسلامی تعلیمات کے معاشی، سیاسی، عمرانی اور فکری پہلو جس طرح آپس میں متحد ہیں، اسی طرح اُس کا تعلیمی پہلو بھی اُن کے ساتھ پیوستہ ہے۔ ہم اسلامی نظام تعلیم میں کسی قسم کی ثنویت کو راہ نہیں دے سکتے۔ اگر ایسی کوشش کریں بھی تو اسلام کا تعلیمی نظام اپنی افادیت کھو دیگا۔ اور وہ انسان دوست اور حیات پرور نتائج نہیں نکلیں گے جن کی توقع اس تعلیمی نظام سے کی جاتی ہے۔

مگر عملاً کیا ہو رہا ہے؟۔ اسلام کے تعلیمی نظام کی زمین میں ثنویت کے پودے کی آبیاری پچھلی دو صدیوں سے کی جا رہی ہے۔ یعنی اُس کے تعلیمی ڈھانچہ کو دینی اور دنیوی خانوں میں تقسیم کر دیا گیا ہے۔ اور نتیجہ یہ نکلا کہ نہ دین رہا اور نہ دنیوی ترقی ہاتھ آئی۔

دراصل دین اور دنیا کی تقسیم ہی غیر اسلامی ہے۔ کیوں کہ اسلام ایک صداقت ہے، ایک

---

[1] INTERCONNECTION   [2] INTERACTION

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

پروگرام ہے زمان و مکانِ محسوس میں پائی جانے والی حیاتِ انسانی کے تزکیہ، ارتقاء اور انسانی اُمت کے اتحاد و یک جہتی کا۔ لہٰذا اسلام اپنے اتحاد و ارتقاءِ انسانیت کے اِس پروگرام میں کسی طرح بھی عقیدہ پرستی، ہیئت پرستی، مذہبی گروہ بندی اور غیر تخلیقی ماضی پرستی کو برداشت نہیں کرتا۔ کیونکہ اسلام کا یہ پروگرام یا ھدایت بیک وقت دنیوی بھی ہے اور دینی بھی۔ بلکہ صحیح الفاظ استعمال کئے جائیں تو یہ خالص دنیوی ھدایت ہے۔ جو دینی ان معنوں میں ہے کہ یہ دنیوی زندگی کو اس غایت یا نصب العینیت کے ماتحت ایسے خطوط پر استوار کرتی ہے کہ حیات کے نفسیاتی اور معاشرتی حوالی میں ایسا صحت مند اور مثبت انقلاب رونما ہو جو اُسے نہ صرف حیات بعد موت میں قربِ الٰہی کی نعمت سے سرفراز کر سکے بلکہ زمان و مکان کے اس محسوس مرحلہ میں بھی وہ اس ارفع و اعلیٰ حالت کا عملی تجربہ کر سکے۔ اس مقصد کے لئے زندگی کو دینی اور دنیوی خانوں میں تقسیم کرنا بے سود ہی نہیں بلکہ بے حد نقصان دہ بھی ہے۔ کیونکہ ہر دنیوی عمل دینی بھی ہو سکتا ہے اور غیر دینی بھی۔ لہٰذا دین اور دنیا کی ثنویت اسلام کے مزاج کے خلاف ہے۔

اگر غور سے دیکھا جائے تو تعلیمی نظام کے ذریعہ ہی حیاتِ قومی یا ملی اپنی داخلی تمناؤں اور نصب العینیوں کا اظہار کرتی ہے۔ ہم نظام تعلیم کے ذریعہ ہی اُس نصب العینی شخصیت کو حاصل کر سکتے ہیں جس کا تصور ہمیں اسلام دیتا ہے۔ اگر تعلیمی نظام کو ہی دینی اور دنیوی خانوں میں بانٹ دیا گیا تو اُس موعودہ اسلامی نصب العینی شخصیت کا حصول ناممکن ہو جائے گا۔ اس اسلامی مقصد کے عملی حصول کے پیشِ نظر دارالعلوموں اور یونیورسٹی کو باہم ملا دینے کی ضرورت ہے تاکہ یونیورسٹی میں پڑھائے جانے والے جدید علوم و فنون کو قرآن و حدیث کے نصب العینوں کی روشنی میں طلبہ کے اذہان میں اُتارا جا سکے۔

اگر دینی مدارس یونیورسٹیوں سے الگ رہے تو ایک طرف تو جدید علوم و فنون سے متعلق اسلامی ہدایات سے ان دینی مدارس کے طلبہ بے بہرہ رہیں گے اور دوسری طرف وہ ان عربی مدارس میں پڑھائے جانے والے مضامین کے متعلق اُن عظیم ترقیوں اور اضافوں سے نابلد رہیں گے جو انسانی تحقیق و کاوش سے ان مضامین میں برسوں سے ہو چکے ہیں۔ کیا ایسی صورتِ حال میں یہ توقع کی جا سکتی ہے کہ یہ ثنویت پسند نظام تعلیم ہمیں ایک بار پھر ابن رشد، ابو نصر، فارابی، غزالی اور ابن تیمیہ، جلال الدین رومی اور ابن عربی جیسی عظیم شخصیتیں دے سکے گا؟ اگر ایسا نہیں تو ہمارے اساطینِ مذہب اپنے ذاتی مفاد اور مرجعِ خلق بننے کی

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

ہو جائے کہ اسلام کا اتنا عظیم الشان نقصان سے دو چار ہو، گوارا فرمالیں گے؟۔ میں سمجھتا ہوں، اگر ایسا گوارا کر لیا جائے تو یہ کھلی ہوئی اسلام دشمنی اور انتہائی خود غرضی ہوگی۔

اگر عربی دارالعلوموں اور جدید یونیورسٹیوں کی تعلیمی فضاء کا موازنہ کیا جائے، جن میں ہمارے دینی و دنیوی طلبہ کے اذہان پروان چڑھتے ہیں تو ہم دیکھتے ہیں کہ دارالعلوموں میں تعلیم حاصل کرنے والے طلبہ کو ایسی کتب پڑھائی جاتی ہیں، جن کے مضامین جامد اور ٹھٹھرے ہوئے اور اُن کے اوراق مرورِ ایام کی گرد سے اَٹے ہوئے ہوتے ہیں۔ اُن کے تنگ و تاریک حجرے میلی چٹائیاں اور گھٹیا قسم کی غذا جو عام طور پر نیم دُھلے برتنوں میں زمین پر بیٹھ کر کھائی جاتی ہے، ان مدرسوں کی چار دیواری کے اندر عہدِ جدید کے علم و ثقافت کی آنکھوں کو چندھیا دینے والی تیز روشنی کی ایک کرن تک نہیں پہنچتی۔ ان میں طلبہ کو بتایا جاتا ہے کہ تسخیرِ فطرت کا عمل اور سائنسی علوم دونوں غیر مذہبی چیزیں ہیں۔ عہدِ حاضر کا انسان فطرت، معاشرہ اور النفس کے متعلق اپنی تحقیق و کاوش سے جتنا علم منکشف کر رہا ہے، یہ علمِ الٰہی کا حصہ نہیں ہے۔ اگرچہ فطرت، معاشرہ اور انسانی شعور و نفس کو اللہ نے ہی تخلیق کیا اور اُن میں کام کرنے والے قوانین بھی اُس نے وضع کئے ہیں، مگر اس تخلیق اور اس کے قوانین کے علم کو علمِ الٰہی نہیں سمجھا جاتا۔

اِن مدارس میں ملٹن، ورڈز ورتھ، شیکسپیئر، گوئٹے اور ٹینی سن وغیرہ کے تخلیق کردہ عظیم ادب سے، جس میں فطرتِ انسانی کے غوامض و اسرار کو بہتر طور پر بے نقاب کیا گیا ہے، طلبہ یکسر بے بہرہ تو رہتے ہی ہیں۔ لیکن وہ فارسی اور عربی کے اعلیٰ ادب سے بھی آگاہ نہیں ہو پاتے۔

فنونِ لطیفہ کے متعلق کچھ جاننا تو کہیں رہا، اُن کا نام لینا ہی کفر بکنے کے مرادف سمجھا جاتا ہے۔ جدید نظاماتِ فلسفہ کے متعلق سمجھ لیا گیا کہ ان میں سوائے زندقہ کے شاید اور کچھ بھی نہیں پایا جاتا ہے۔ چاہے سپینوزا، کانٹ اور ہیگل مذہب کو دلائل قاطع سے کتنا ہی مسلح کر گئے ہوں۔

غرض ذہن اور ذوقِ جمال کی پرورش اور جلاء کے لئے کوئی سامان نہیں مہیا کیا جاتا۔ ان مدارس کے فارغ التحصیل طلبہ کے لئے حیاتِ حاضرہ کی شاداب اور زرخیز راہیں تقریباً مسدود ہوتی ہیں۔ ایسی مفلس اور مایوس کُن فضاء میں جس قسم کے وسعت پذیر ذہن کی تعمیر ہو سکتی ہے، عیاں ہے۔ اور یہ ذہن دامنِ حیات کو علم و تہذیب کے جن انمول موتیوں سے مالا مال کر سکتا ہے، وہ بھی

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

ظاہر و باہر ہے۔

اس کے برعکس یونیورسٹیوں اور اُن کی اقامت گاہوں کی پاکیزہ وارفع اور علم پرور فضا ہمارے سامنے ہے۔ اُن کی پُرشکوہ عمارتیں، اُن کے شاداب سبزہ زار، اُن کی تازہ ہوا اور روشنی سے بھرپور اقامت گاہیں، اُن کے وسیع وعریض لیکچر ہال اور تعلیمی کمروں کے آگے بڑے بڑے پھیلتے ہوئے برآمدے، ہزاروں اور لاکھوں کتابوں پرمشتمل لائبریریاں، اُن کی چاردیواری کے اندر چاردانگ عالم سے تازہ بتازہ اور نو بہ نو تحقیق شدہ علم کھچا چلا آتا ہے۔ اُجلے لباس پر سیاہ طیلسان پہنے ہوئے اور ہاتھوں میں جدید ترین علوم پرمشتمل بھاری بھرکم کتابیں لئے طلبہ و طالبات کے گروہ، ذوقِ جمال کی پرورش کے لئے تمام فنونِ لطیفہ کی تعلیم کا بندوبست، اور اُن کی زمان و مکان پر کمند ڈالنے اور فطرت کے پوشیدہ بھیدوں کو بے نقاب کرنے والی تجربہ گاہیں، اُن کے ذہنوں کو بے حد وسعت اور ہر نئے تجربہ کو اپنانے کی توفیق عطا کرتی ہیں۔ ان یونیورسٹیوں میں کائنات کے گوشوں کو کہاں تک کھنگالا گیا ہے اور اس سے انسان کے ذہنی عروج کی کیا حالت ہے۔ ایک اقتباس کے ذریعہ پیش خدمت ہے۔

"آئین سٹائن کہتا ہے، کائنات محدود مگر بیکراں ہے، ایک طرف سے آواز آتی ہے۔ کائنات ہر لحظہ بدل رہی ہے۔ دوسری طرف سے شور اُٹھتا ہے، کائنات سکڑ رہی ہے۔ کوئی کہتا ہے: مادہ فنا ہوکر اور توانائی میں تبدیل ہوکر فضا میں بکھر رہا ہے۔ لیکن ساتھ ہی خبر آتی ہے کہ بیرونی فضا میں دُور کہیں مادے کی تخلیق ہو رہی ہے۔ اِدھر مادے اور نور کی ثنویت اور مادے کی تعمیم در تقسیم سے معلوم ہوتا ہے کہ ہم کسی انقلاب آفریں نظریہ کے قریب آ پہنچے ہیں جو پُرانی گتھیوں کو سلجھا کر کائنات کے معمّے کا حل سلجھائے گا۔" (جدید طبیعیات کا تعارف)

کیا اس موازنے سے ہمارے اکابرِ مذہب اس بات کو نہیں سمجھ سکتے کہ آخر دینِ حق اور اسلام کے علوم جدیدہ نے کیا جرم کیا ہے کہ اُنھیں دارالعلوموں کے یتیم خانوں میں رکھ کر اُن کے ساتھ سوتیلی اولاد کا سا سلوک کیا جائے۔

درسِ نظامی کا مسئلہ

تاریخِ اسلام کے مطالعہ سے پتہ چلتا ہے کہ آج کی طرح کبھی بھی دینی اور دنیوی مدارس الگ

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

الگ نہیں تھے۔ ایک ہی درس گاہ میں جہاں حدیث و تفسیر کا علم پڑھایا جاتا تھا، وہیں اُس عہد کے دوسرے دنیوی علوم کا درس بھی دیا جاتا تھا۔ درسِ نظامی جن مضامین پر مشتمل ہے، اُنہیں دیکھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ خالص دینی نصاب نہیں ہے۔ بلکہ یہ مضامین اُس عہد کے مختلف علوم و فنون پر مبنی ہیں منطق، فلسفہ، قانون، طب، ریاضی اور جیومیٹری اگر آج دینی علوم نہیں ہیں تو اُن دنوں بھی نہیں تھے۔

اصل بات یہ ہے کہ جس طرح آج ہم سمجھتے ہیں کہ جدید ادب، طبیعیات و کیمیا، فنونِ لطیفہ، معاشیات و سیاسیات اور فلسفہ و منطق پڑھنے سے قرآن و حدیث کے غوامض کو سمجھنے میں مدد ملتی ہے۔ کیوں کہ یہ علوم حیاتِ ذہنی اور عمرانی کے مختلف پہلوؤں پر روشنی ڈالتے اور اُن میں کام کرنے والے فطری قوانین کا انکشاف کرتے ہیں۔ جن کی مدد سے ہم اِن علوم میں دست گاہ حاصل کرتے اور اُنہیں اپنی مرضی کے مطابق استعمال کرتے ہیں۔ ہمارے قدیم بزرگوں نے بھی اس حقیقت کو سمجھ کر اپنے عہد کے تمام علوم پر مشتمل ایک نصاب مرتب کیا اور ان علوم کی تحصیل کے بعد جس طرح کا اندازِ نظر پیدا ہوا، اُس سے دینی علماء نے قرآن و حدیث اور فقہی مسائل کی تفسیر و تشریح فرمائی۔

بعینہٖ برطانوی عہد کے آغاز میں جب یورپ سے درسِ نظامی میں پڑھائے جانے والے مضامین، مزید تحقیق و تفحص سے اضافہ پذیر ہو کر متحدہ ہندوستان میں پہنچے تو اُن کی تعلیم سے بھی ایک اندازِ نظر پیدا ہوا، جو ظاہر ہے کہ قدیم اندازِ نظر سے زیادہ ترقی یافتہ اور زیادہ پُرمایہ تھا۔ اور سرسید، مولوی چراغ علی اور مفتی محمد عبدہٗ وغیرہ جدید علماء اسلام نے اس ترقی یافتہ اندازِ نظر سے قدیم تفاسیر، علم الکلام اور دوسرے دینی مضامین کا نئے سرے سے جائزہ لیا تو منطقی طور پر جہاں اُنہوں نے ان مضامین میں قابلِ قدر نئے اضافے کئے، ان کو نئے سرے سے مدون کیا، وہاں اسی جدوجہد میں اپنے قدیم بزرگوں کی آراء و نقطۂ نظر سے اختلاف بھی کیا۔ مگر دارالعلوموں میں درسِ نظامی پڑھنے والے بزرگ چونکہ اُن کے ترقی یافتہ اندازِ نظر سے، جو نئے علوم کے مطالعہ سے پیدا ہوئی تھی، ناواقف تھے، لہٰذا اُنہوں نے ان جدید اضافوں اور نئی تنقید کو دین میں تحریف کے مترادف خیال فرمایا۔

آج جس عہد میں یہ تحریر لکھی جا رہی ہے، وہ اپنے مانیہ میں اُس دور سے بھی آگے نکل گیا ہے، جس کا آغاز برطانوی عہد کے اوائل میں ہوا تھا۔ وہ علوم جنہیں سرسید کے عہد میں علی گڑھ یونیورسٹی میں پڑھایا جاتا تھا،

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

آج مزید ترقی کر چکے ہیں۔ اور کئی نئے علوم جن کی تدوین اُس عہد میں عمل میں نہیں آئی تھی، آج مدوّن ہو چکے ہیں۔ مغرب کی نشاۃِ ثانیہ کے بعد ایک بار پھر ۱۹۱۷ء کے وسط ایشیاء کے عمرانی انقلاب نے ایک ایسے اندازِ نظر کو تشکیل دیا ہے، جو اپنے جوہر میں سرمایہ دارانہ نظام کے ماتحت پروان چڑھنے والے علوم سے ترتیب پانے والے اندازِ نظر سے قطعاً مختلف ہے۔

لہٰذا آج کا مسلمان طالب علم جب ان علوم کا مطالعہ کرتا ہے تو اُس کا اندازِ نظر سر سیّدؒ اور مولانا شبلیؒ سے بھی زیادہ ترقی یافتہ اور پُرمایہ ہو جاتا ہے۔ اور اس اندازِ نظر سے جب وہ قرآنِ حکیم کا مطالعہ کرتا اور دوسرے دینی علوم کو پڑھتا ہے تو اُس کے نتائج اُنیسویں صدی کے وسط آخر کے جدید علماءِ اسلام سے بالکل مختلف صادر ہوتے ہیں۔ چنانچہ درسِ نظامی کے علوم کے مطالعہ سے پیدا ہونے والے اندازِ نظر کے لئے اس عہد میں کوئی جگہ نہیں ہے۔ ہمارا ملک جتنی تیزی کے ساتھ صنعتی بنتا جائے گا اور ہمارے خارجی تعلقات باہر کے ممالک سے جتنے گہرے ہوتے جائیں گے، اس قدیم اندازِ نظر کی صف لپیٹنے میں اتنی ہی جلد مدد ملے گی۔

دینی اور دنیوی کی تقسیم کا اب وقت پورا ہو چلا ہے اور بہت ہی کم عرصہ رہ گیا ہے جس میں یہ اندازِ نظر دو چار سانس اور لے سکتا ہے۔ یہ فیصلہ تاریخ کے ارتقائی عمل کا ہے اور تاریخ کا ارتقائی عمل، حق تعالےٰ کی فعلیتِ مطلقہ کے تخلیقی عمل کا دوسرا نام ہے۔ لہٰذا یہ سمجھنا کہ درسِ نظامی کوئی آسمانی نصاب ہے، جس میں ردّ و بدل کرنا گناہِ عظیم ہے، ایک غیر عقلی بات ہے۔ کہا جاتا ہے کہ درسِ نظامی کے مطالعہ سے دینی مسائل کو سمجھنے کے لئے ٹھوس علمی ذہن پیدا ہوتا ہے، تو یہ بات کسی حد تک درست ہے۔ مگر یہ ٹھوس علمی ذہن اُسی ادب کا مطالعہ کر سکتا ہے جو درسِ نظامی کی اصطلاحی زبان میں لکھا گیا ہے۔ جب اس ادب کو آج کے جدید عہد کی علمی زبان میں پھر سے مدوّن کر لیا گیا تو درسِ نظامی کی افادیت قطعاً ختم ہو جائے گی۔ اور یہ بات ایسی اہم نہیں ہے کہ اس کے لئے اتنے بڑے بڑے دارالعلوم قائم کئے جائیں یا اُنہیں باقی رکھنے کے لئے وافر رقوم خرچ کی جائیں۔ بلکہ اُس کے برعکس صحیح راستہ یہ ہے کہ ہمارے مذہبی اذہان جدید علوم کی تحصیل کے ساتھ درسِ نظامی کی زبان کا بھی مطالعہ کریں اور ان دینی علوم کو آج کی زندہ علمی زبان میں نئی نسلوں کے لئے پھر سے مدوّن کریں۔

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

آج درسِ نظامی کو قائم رکھنا ایسے ہی ہے، جیسے آج کے سائنسی مسائل کو سمجھنے اور پڑھنے کے لئے دو سو برس پہلے کی قدیم لاطینی اور یونانی زبان میں مدوّن شدہ سائنسی مسائل کو پڑھا جائے۔ یقیناً ایسا کرنا ایک احمقانہ فعل ہوگا۔ اس بحث سے یہ معلوم ہوا کہ درس نظامی خالص دینی معاملہ نہیں ہے بلکہ یہ ایک دنیوی مسئلہ ہے جس کے ساتھ وقت ویسا ہی سلوک کرے گا، جیسا اُس نے دیگر قدیم علوم کے ساتھ کیا ہے۔

دارالعلوموں کی آزاد حیثیت کا مسئلہ

کہا جاتا ہے کہ دارالعلوموں کو محکمۂ اوقاف کے ماتحت دے دینے سے اُن کی آزاد حیثیت ختم ہو جائے گی۔ اگر مسئلہ کو بہ نظرِ اعماق دیکھا جائے تو پتہ چلے گا کہ اِن دینی درس گاہوں کی آزاد حیثیت آج تک کبھی قائم ہی نہیں ہوئی۔ آزاد حیثیت کا مفہوم یہ نہیں ہوتا کہ کوئی ادارہ حکومت کی سرپرستی سے باہر ہو، بلکہ حقیقی مفہوم یہ ہوتا ہے کہ وہ ادارہ کسی بھی معاشرتی طبقہ کی مالی یا اخلاقی مدد سے بے نیاز ہو اور محض اپنے ہی ذرائع سے اپنے وجود کی حفاظت کر رہا ہو۔

اس کے برعکس ہمارے مذہبی مدرسے متحدہ ہندوستان میں نوابوں اور جاگیرداروں کی مالی اور اخلاقی سرپرستی میں پروان چڑھتے تھے۔ اور آج مل مالکوں اور زمینداروں سے دولت کی تھیلیاں وصول کرتے ہیں۔ ملک کے مالدار اور سرمایہ دار طبقہ کی سرپرستی کا نتیجہ یہ ہے کہ ہمارے کسی دارالعلوم سے اسلامی سوشلزم کے حق میں کبھی کوئی آواز نہیں اُٹھی بلکہ ان کے ماہناموں میں رُوس اور امریکہ کو ترازو کے ایک ہی پلڑے میں تولا جاتا ہے۔ اور یہاں تک ارشاد فرمایا جاتا ہے کہ اِن دونوں کی حیثیت میں محض سؤر اور کتے کا فرق ہے۔

ابھی پچھلے دنوں کراچی کے ایک مشہور عالِم کی طرف سے مزدوروں کی ہڑتال کے متعلق فتویٰ " ماہنامہ انشاء" میں شائع ہوا تھا جس میں فرمایا گیا تھا کہ چونکہ مزدور اپنے آپ کو سرمایہ دار کے ہاتھ میں بیع کر دیتا ہے اس لئے اُسے ہڑتال کرنے کا کوئی حق نہیں ہے۔ یہ ہے اُس دانش کا شاہکار جسے درسِ نظامی نے پیدا کیا ہے۔ یہ دانش اتنی بُودی اور ناسمجھ ہے کہ درسِ نظامی کی تدوین کے عہد میں پائے جانے والے غلام اور آج کے آزاد محنت کش کی معاشرتی حیثیت میں کوئی فرق نہیں دیکھ سکتی۔ لہٰذا یہ سمجھنا کہ ہمارے دینی دارالعلوم کسی آزاد حیثیت کے مالک ہیں ایک فریب سے زیادہ نہیں۔ یہ مدارس ملک کے امیر ترین طبقہ کی سماجی

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

حیثیت کو برقرار رکھنے اور اس کا دفاع کرنے کا ایک آلہ ہیں جنہیں یہ طبقہ، محنت کش عوام کے خلاف استعمال کرتا رہتا ہے۔

ہمارے مذہبی رہبروں کو ایک بات اچھی طرح ذہن نشین کر لینی چاہیئے کہ وہ جس عہد میں سانس لے رہے ہیں، یہ اتنا ظالم ہے کہ مفاد پرست عزائم کو چاہے کتنے ہی مقدس لبادوں میں لپیٹ کر رکھا جائے، یہ ان سب کو چاک کر کے حقیقت کو عریاں کر دیتا ہے - اس عملِ جراحی میں وہ اپنے آپ کو تاریخی لحاظ سے حق بجانب تصور کرتا ہے۔ اور اس تاریخی واقعہ کو بھی کبھی نظر انداز نہیں کرنا چاہیئے کہ آج سے نصف صدی پہلے جب وسط ایشیاء، ترکی اور دوسرے مسلم ممالک میں تاریخ نے اپنا رُخ بدلا۔ تو اُس عہد کے دینی مدارس، اُن کے فارغ التحصیل علماء کے مواعظ، اُن کی امامت و خطابت اور درس و تدریس اس تبدیلی کو نہ روک سکے۔ کیونکہ تاریخ کی تبدیلی حق تعالیٰ کی شان کی تبدیلی ہوا کرتی ہے۔ آج وسط ایشیا کا عمرانی تجربہ سارے کرۂ ارض پر پھیل چکا ہے۔ اور اقوامِ عالم اس بے حد ترقی پسند عمرانی قوت کی منشاء کے مطابق اپنے تعلیمی، معاشی، معاشرتی اور فکری اداروں کو نئے سرے سے ترتیب و تدوین دینے میں مصروف ہیں۔ لہذا ہمارا مذہبی ذہن بھی اس نئے عمرانی اور فکری تجربہ سے متاثر ہوئے بغیر نہیں رہ سکتا۔ اس تاریخی جبریت کی اہمیت کو جتنی جلد ہم تسلیم کریں ہمارے حق میں بہتر ہوگا۔ کیوں کہ تاریخ کے جبری عمل کو روکنا بشری قوتوں کے اختیار سے باہر ہوتا ہے۔ (باقی)

اسلامی منہاج کی تاریخ

ڈاکٹر فضل الرحمٰن

قرآن، سنت، اجتہاد اور اجماع صرف فقہ کے اصولِ اربعہ نہیں، بلکہ تمام فکرِ اسلامی کی اساس بھی یہی چار اصول ہیں۔ تاریخ اسلام بالخصوص اس کے قرون اولیٰ میں ان اصولوں کا کیسے اطلاق کیا گیا۔ اور مختلف حالات اور زمانوں میں ان کے تحت افکار اسلامی کیسے ارتقاء پذیر ہوتے رہے۔ یہ ہے اس کتاب کا موضوع۔

(بزبان انگریزی) ——— قیمت آٹھ روپے

ادارۂ تحقیقاتِ اسلامی، اسلام آباد (پاکستان)

© rasailojaraid.com